

بسم اللہ الرحمن الرحیم ط

اشارات

تاریخ کی حلق گردانی کرتے ہوئے یوں توفیقات کے بے شمار واقعات سامنے آتے ہیں، لیکن شاید ان میں سب دلچسپ فتح وہ ہے جو ٹرائے (TROY) کے محاصرے میں اہل یونان کو نصیب ہوئی۔ یونانیوں نے ایک مدت دراز تک ٹرائے کے رہنے والوں کو گھورے رکھا۔ وہ اپنی ساری قوت و طاقت کے ساتھ کئی مرتبہ ان پر حملہ آور ہوئے مگر ٹروجنز (TROJANS) کے عزم و ثبات نے انہیں ہر دفعہ پسپا کر دیا۔ بالآخر یونانی ہمت ہار بیٹھے اور انہوں نے محاصرہ اٹھا لینے کا فیصلہ کیا۔

عین اس وقت جب کہ وہ بے نیل مرام باپس لوٹ رہے تھے چند ذہین آدمیوں نے اُن سے کہا: اگر جلدی اور قہاری دشمن پر فتح حاصل کرنے میں ناکام رہی ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اب ہم دل شکستہ ہو کر بیٹھ جائیں۔ بسا اوقات جہاں قہر و جبروت عاجز آجاتا ہے وہاں چالاکي اور عیاری کام نکال سکتی ہے۔ اس لیے آؤ اب ذرا اس نسخہ کو آزمائیں۔ بد دل سپاہ نے جب یہ الفاظ سنے تو اس کی جان میں جان آئی۔ یونانی چالبازوں نے فوراً کاتھ کا ایک ایسا گھوڑا تیار کیا جو اندر سے کھوکھلا تھا۔ اُس میں بہترین جانباڑوں کو چھپا دیا گیا اور باقی فوج قریب کے ویرانوں میں اس طرح منتشر ہو گئی گویا کہ اب وہاں سوائے کٹری کے گھوڑے کے اور کوئی چیز موجود نہ تھی۔ ٹروجنز جب صبح اٹھے تو انہوں نے فرحت و انبساط کے طے جلے جذبات کے ساتھ دیکھا کہ یونانیوں نے محاصرہ اٹھا لیا ہے اور وہ اپنے وطن واپس جا چکے ہیں۔ اس لیے وہ قلعے کی چار دیواری سے نکل کر اس عجیب و غریب گھوڑے کے گرد جمع ہو گئے اور بالآخر انہوں نے اس بات کا

فیصلہ کیا کہ اس مفید اور کارآمد چیز کو قلعہ کے اندر لے جانا چاہیے۔ یہ فیصلہ کرتے ہوئے انہیں اس بات کا قطعاً احساس نہ ہوا کہ جس چیز کو وہ دلچسپ اور اپنے حق میں نفع بخش خیال کر رہے ہیں وہ اُن کے لیے کتنی نقصان دہ اور ہلاکت خیز ہے۔ اُس کے اندر کس قسم کے جارحانہ خرائم انسانی شکل میں چھپے ہوئے ہیں اور وہ اپنی حماقت سے خود بربادی کو کھینچ کر اپنے گھر میں داخل کر رہے ہیں۔

یہ گھوڑا جس وقت قلعہ میں لایا گیا تو اہل ٹرائے کے اندر خوشی اور مسرت کی ایک ہر دڑ گئی۔ بوندھے، بچتے، محمدیوں اور مرد اسے آزادی اور حریت کی دیوی سمجھ کر اس کے گرد ناچنے لگے۔ یہ لوگ رنگ ریبوں میں اتنے بدست ہو گئے تھے کہ انہیں اپنی ہوش تک نہ رہی وہ یونانی، جو گھوڑے کے اندر چھپے بیٹھے تھے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس قلعہ کے محاذ اور پاسبان شراب کے نشے میں چرہ ہیں تو انہوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر تواریں سونت لیں اور پھرے ہوئے مشیروں کی طرح سب سے پہلے ان لوگوں کو قتل کرنا شروع کیا جن کے سپرد قلعہ کی حفاظت اور پاسبانی کا کام تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اس قلعہ کے سارے دروازوں کو چوڑھوں دیا۔ یونانی فوج کے وہ دستے جو ارد گرد جنگلوں میں منتشر پڑے تھے وہ اشارہ پاتے ہی جمع ہو گئے اور اُن کی آن میں قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ امداد اس طرح دہ کام جسے سرانجام دینے کے لیے بڑی سے بڑی قوت بھی کارگر ثابت نہ ہوئی تھی اُسے عیاری اور چال بازی نے ایک لمحہ کے اندر پانیہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

دور جدید کا استعمار بالکل اسی طرز پر مختلف ممالک اور اقوام کو منہ لوگوں کرتا ہے۔ البتہ وہ کاٹھ کا گھوڑا استعمال کرنے کی بجائے تہذیب و شائستگی کی پری کو کام میں لاتا ہے۔ اس پر ہمارے شے کی ظاہری شکل و صورت اُس گھوڑے سے کہیں زیادہ پُر فریب ہے اور اس کا باطن اُس کی بہ نسبت بہت زیادہ کھوکھلا اور تاریک ہے۔ اس کے پیٹ میں اس قدر گت جالشی ہے کہ ہر قسم کی بُرائی، ظلم و تعدی اور جارحیت کو آسانی کے ساتھ چھپایا جاسکتا ہے۔ دنیا کی کمزور اقوام تہذیب کے اس دیباہ ستبداد کو جو آزاری

اور عربیت کی تعلیم پری کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے، بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے کھینچ کر اپنے ممالک میں لے جاتی ہیں۔ مگر سبب یہ اثر دہاویاں قدم جمایا ہے تو پھر اس کے اندر سے جارحانہ عزائم نکل کر ان استقبال کرنے والی بستیوں کو تاخت و تاراج کر دیتے ہیں۔ ان پر نصیب بستیوں کے پہننے والے کچھ دیر تو استبداد کی یہ ہلاکت خیز رہاں کیف و مستی کے طے چلے جذبات کے ساتھ دیکھتے ہیں مگر ایک مدت دراز تک مسلسل چڑھیں کھا لینے کے بعد جب اُن کا نشہ کا فور ہو جاتا ہے تو پھر وہ بدلہ ہیں لیکن فطرت اس وقت ان کی آہ و فغاں سننے کی بجائے اُن سے بڑے ہی طنز پر انداز میں کہتی ہے:

ایں جہہ آور ز دوست !

وہ شخص جو معمولی سمجھ بوجھ بھی رکھتا ہے اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ مسلمان ممالک پر استعمار کی گرفت مضبوط کرنے کے لیے اب تیر و تفنگ کی بجائے تہذیب و تمدن کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ استعماریت اب قوت و طاقت کے ساتھ مسلمانوں کو مفتوح نہیں کرتی بلکہ وہ ترقی اور آبادی کی حسین اور دلآویز صورت بنا کر سیم و زر کی جھانجھریں پہنے ان کی طرف لپکتی ہے۔ یہ لوگ ٹرڈ جنز کی سی سادگی کے ساتھ خود اپنے ہاتھوں سے سہارا دیتے ہوئے اسے اپنی قوم کے اندر لے جاتے ہیں، وہاں اس کے ساتھ بڑی ہی دلیانہ عقیدت کا اظہار ہوتا ہے اور قوم کا ہر فرد اپنی قیمتی سے قیمتی متاع اس کے قدموں میں بڑی خوشی کے ساتھ لا ڈالتا ہے۔

آپ پچھلے ایک سو سال کے واقعات پر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ کیا مغربی استعمار نے تمام مسلم ممالک کے اندر یونانیوں کا شرمناک کھیل نہیں کھیلا اور کیا خود ان ممالک کے رہنے والوں نے اہلِ ٹرانس کی سی حماقت کا مظاہرہ نہیں کیا؟ امت کے جن لوگوں نے استعماریت کی اس عیغار پر مسلمانوں کو متنبہ کرنے کی کوشش کی۔ ان کی باتوں کو رحبت پسندی اور تنگ نظری کہہ کر رد کر دیا گیا۔ انہیں قوم اور وطن کا دشمن گردانا گیا، انہیں ترقی کی راہ میں ایک سنگ گراں سمجھ کر ہٹانے کی کوشش کی گئی۔ اس تہذیب

جدیدان لوگوں کو اتنا بدست کر رکھا تھا کہ انہیں اس امر کا کبھی احساس تک نہ ہونے پاتا کہ ان کے تہذیبی قلعے ہمارے جوار ہے۔

اب کچھ عرصہ سے جب کہ اُدھر تہذیب مغرب کا طلسم کسی حد تک ٹوٹ چکا ہے اور اُدھر مسلمانوں کا نشہ بھی کچھ اُترنے لگا ہے تو ان کے اندر اپنی بیاہی کا احساس ابھرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ وہ دل ہی دل میں استعمار کی ریشہ و دانیوں پر کڑھتے ہیں۔ اور کھم کھم ان کی یہ کڑھن جھنجھلاہٹ کی صورت اختیار کر رہی ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لیے وہ جدوجہد بھی کرتے ہیں اور ہر قسم کی قربانیاں بھی دیتے ہیں لیکن اس کی گرفت سے آزاد نہیں ہو پاتے۔

آج سے چند سال پیشتر جب ان کے اندر اپنی بربادی کا احساس پیدا ہوا تو انہوں نے یہ سمجھا کہ ان کی یہ بربادی مسلمان ممالک کی غلامی کی وجہ سے ہے چنانچہ انہوں نے ان ممالک کو آزاد کرانے کے لیے نہایت ہی مخلصانہ اور جرات مندانہ کوششیں کیں اور اس کے نتیجے میں بیشتر ممالک آزاد ہو گئے۔ مگر اس کے فوراً ہی بعد انہوں نے یہ محسوس کیا کہ استعمار کی جس غارتگری سے بچنے کے لیے انہوں نے ان ممالک کو غیروں کے قبضے سے آزاد کر لیا ہے وہ تو ان کے اندر اسی طرح موجود ہے اور وہ آزاد ہو کر بھی اس استعمار کی ہوسناکی کی بھینٹ چڑھتا جا رہا ہے۔ اس صورت حال نے مسلمانوں کو بے حد پریشان کر رکھا ہے مگر وہ کچھ سوچ نہیں پاتے کہ آخر وہ اس مصیبت سے کس طرح نجات حاصل کریں۔ پریشانی کے اسی عالم میں کبھی وہ صنعتی اور مادی ترقی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اور کبھی دنیا کے مختلف سیاسی بلاکوں کی طرف مادی کے لیے لپکتے ہیں مگر ان کا اصل مقصد حل نہیں ہو پاتا، اور ان کی مصیبت جوں کی توں قائم رہتی ہے۔ یہ چیز ہر مسلمان کے لیے سخت چڑھن کا سبب ہے اور اس لیے دنیا کا ہر حساس دل کسی نہ کسی انداز سے اس پر ضرور غور کرتا ہے۔ ہم بھی اس نجات میں آج انشاء اللہ اسی موضوع پر چند گزارشات پیش کریں گے اور ان تدابیر کی نشاندہی کریں گے جن پر

عمل پیرا ہو کر امت مسلمہ مغربی استعمار کی آفت سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے۔

کسی مرض کا علاج اُس وقت تک کارگر ثابت نہیں ہو سکتا جب تک کہ مریض کے ماحول کو اچھی طرح سمجھ نہ لیا جائے۔ اس لیے مسلمانوں کے مرض کی تشخیص کرنے اور اُس کا علاج تجویز کرنے سے پیشتر سب سے ضروری چیز یہ ہے کہ ہم اُن حالات کا جائزہ لیں جن میں مسلمان اور دنیا کی دوسری اقوام زندگی بسر کر رہی ہیں۔

پہلی چیز جو مسلمانوں کے ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے وہ یہ ہے کہ زمان و مکان پر انسان کی فتح نہ پوری دنیا کو ایک وحدت بنا دیا ہے۔ انسان اب حالات کے ماتحت اس بات پر مجبور ہو گیا ہے کہ وہ وطن و نسل کی تنگ دامنیوں سے نکل کر سیاست و معیشت کی وسیع تر وحدتوں کو اپنی تعمیر نو کی اساس بنائے۔ اس لیے دنیا کی جو قوم بھی اب خاک و وطن کو اپنی پناہ گاہ بناتی ہے وہ زمانے کی دستبرد سے اپنے آپ کو زیادہ دیر تک بچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی لہذا مسلمانوں کو یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اب قومی، وطنی، نسل یا لسانی حصار انہیں مغربی طیارے سے کبھی نہیں بچا سکتے۔ اب ایک قوم دوسری قوم سے نہیں ٹکراتی، ایک نسل دوسری کے خلاف صف آرا نہیں ہوتی بلکہ ایک تہذیب دوسری سے سرد آزاں ہوتی ہے اور ایک تمدن دوسرے کے درپے آنا رہتا ہے۔ آج کشمکش قوموں اور نسلوں کی تنگ حدود سے نکل کر افکار و نظریات کے وسیع میدانوں میں برپا ہے اور اقوام و نسل کی قسمت کے فیصلے اب انہی میدانوں پر ہوتے ہیں۔

پھر ہمیں اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے میں تامل نہ ہونا چاہیے کہ مغرب مادی ترقی کی قدر میں اب اتنا آگے نکل گیا ہے کہ مسلمان اس میدان میں کبھی بھی اُسے نہ بچا نہیں دکھا سکتے۔ ہم یہ اس لیے نہیں کہہ رہے کہ مسلمان دھڑکتے ہوئے، بلکہ ہم یہ گزارش صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ وہ حقیقت حال سے صرف نظر نہ کریں اور حقائق کو سامنے رکھ کر اُسے بڑھنے کی کوشش کریں۔ مسلمان اگر دنیا میں اخلاقی طاقت بننے کی بجائے محض مادی قوت بننے کی سعی کریں گے تو ان کی حیثیت ہمیشہ ایک محتاج اور دست نگر قوم کی ہی ہوگی جس کو مغربی استعمار بے زبان نگاہ کی

طرح جس طرف چاہیگا بالکل میکانیکی طور پر ہانکتا ہٹا لے جائیگا۔ لیکن اگر وہ اس کے برعکس اخلاق کے بل بوتے پر دنیا میں جینا سیکھیں گے تو پھر وہ نہ صرف خود اس کمرہ ازنی پر ایک رہنما قوت ثابت ہونگے بلکہ اُن کی متقاضی کشش جان کے دشمنوں اور خون کے پیاسوں میں سے بھی مخلص رقتی اور دلسوز فدائی تلاش کر لگی۔ اخلاق انسانوں کو آپس میں جوڑ رکھتا ہے اور دنیا پرستی انہیں ایک دوسرے کا دشمن بناتی ہے۔ مسلمانوں کا وہ کونسا خطہ ہے جس میں دین و اخلاق کو چھوڑ کر صنعتی اور مادی ترقی کے لیے سرتوڑ کر کششیں نہیں کی گئیں لیکن اُن کا جو کچھ خسر ہوا ہے وہ بھی کسی دیدہ و در سے پوشیدہ نہیں۔ دنیاوی فوائد و لذائذ کے جنوں نے اُن کے اندر نہ صرف دشمنی اور رقابت کی آگ بھڑکائی ہے بلکہ انہیں مغرب کا بے دام غلام بھی بنا دیا ہے۔ اس صورت حال کو جانتے ہوئے یہ عین حماقت ہوگی اگر ہم اپنی قوموں اور صلاحیتوں کو محض مادی اسباب و وسائل جمع کرنے میں صرف کرتے رہیں۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی قسمت کے بارے میں کوئی فیصلہ کرتے ہوئے یہ امر لمپی طرح ملحوظ خاطر رہنا چاہیے کہ ان کا تصوبہ دین و دوسری اقوام کے تصوبہ مذہب سے بالکل الگ اور جدا گانہ ہے۔ اس لیے دین اور اس کی روایات کے ساتھ ان کی وابستگی کی نوعیت بھی دوسری اقوام سے یکسر مختلف ہے۔ ان کے ہاں دین خدا اور نبرد سے کے درمیان کوئی پرائیویٹ رابطہ نہیں بلکہ یہ اُن کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا مبداء اور اساس ہے۔ یہ اگر ایک طرف ان کے فکر میں سلجھاؤ و طبیعت میں سلامتی، اخلاق میں مضبوطی اور روح میں لطافت پیدا کرتا ہے تو دوسری طرف اُن کی معاشرت میں حسن سلوک، تہذیب میں فضیلت، تمدن میں توازن اور معیشت میں عدل و مواساة کا ضامن بھی ہے۔ اس سے مسلمان نہ صرف اپنے قلب کے اندر سوز و گداز پیدا کرتے ہیں بلکہ اسی کی قوت سے وہ دنیا میں سر ملندہ اور سرفراز ہوتے ہیں۔ یہ دین ان کا ایک ایسا مضبوط ترین حصار ہے جو ان کی شیطنت کے ہر حملے سے خواہ وہ فکر و نظر کا ہو یا لشکر و سپاہ کا، پوری طرح حفاظت کرتا ہے۔ اس لیے اس دین کو جو ان کی ساری زندگی پر حاوی ہے ترک کر دینا کوئی سہل اور آسان کام نہیں۔

قریب قریب یہی تعلق مسلمانوں کا اپنی روایات سے بھی ہے۔ مسلمانوں کا ماضی بڑا درخشاں اور

تائبہ ہے اور اس اعتقاد سے وہ اس دیر سید کو جس میں حضور سرور کائنات اور اُن کے حبیبِ انقدرِ تقدار کا
 نے اپنی پاکیزہ زندگیاں گزاریں، ہمیشہ ایک استغیث کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ اسی دور کے ساتھ ان کا تعلق
 بڑا گہرا اور پائیدار ہے۔ انہیں روایات نے سماںوں کو اپنی آغوش میں پالا ہے، انہیں کی وجہ سے یہ
 قوم بغیر کسی خارجی سہارے کے آج تک زندہ چلی آتی ہے، انہیں کس دم قدم سے اس کے اندر زندگی کی
 حرارت اور کچھ کونے کی تمنا پیدا ہوتی ہے۔ ان روایات کے نقوش ہیں اس کے شعور کی خارجی سطح پر ہی
 جھلکتے ہوئے نظر نہیں آتے بلکہ وہ ہیں اس قوم کے جذبات و احساسات کی گہرائیوں میں بھی جھلکتے ہوئے
 دکھائی دیتے ہیں۔ ظاہریات سے کہ جس چیز نے انسان کے فکر سے بیکراؤس کے قلب تک کو متحرک رکھا ہو
 اور جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں کا احاطہ کیے ہوئے ہو اُس کی گرفت کو آسانی کے ساتھ کھینچ
 نہیں کیا جاسکتا یہ کام صرف اُسی صورت میں سرانجام پاسکتا ہے جب خود قوم کو صفوِ ہستی سے محروم کر دینے
 کا ناپاک عزم کر لیا جائے۔

امتِ مسلمہ بلاشبہ اس وقت اعطاء کا شکار ہے لیکن ہم اُسے اتنا بیوقوف نہیں سمجھتے کہ وہ مغربی
 تہذیب و تمدن کی ظاہری چمک و مک سے مرعوب ہو کر کہ دین اور دینی روایات کو ترک کرنے پر آمادہ
 ہو جائے گی اور اس طرح خود اپنے ہاتھوں سے اپنے شانے کا سامان فراہم کر لے گی۔ مسلمانوں کی عظیم اکثریت
 اسلام پر نہایت پختہ ایمان رکھتی ہے۔ البتہ غیر ملکی سامراج کی جبری اور حیاری نے اور اس کے اپنے گھر کے
 دانا و دشمنوں اور نادان دوستوں نے اسے قوت و استحکام کے اُن لانگال غولوں سے محروم کر رکھا ہے جو
 اسلام کے ذریعہ اسے ماضی میں حاصل ہوتے رہے ہیں۔ اب وقت ہے کہ ہم غیروں کی طرف دیکھنے کی
 بجائے اسی کی طرف توجہ دیں اور زبانی اشتعال پر قناعت کرنے کی بجائے بالفعل اس سے فائدہ اٹھائیں۔

اس راہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ ہم دین کے معاملے میں اب بالکل کیسو ہو جائیں۔ ہماری اس کیسوئی
 پر ہی ہمارے مستقبل کا سارا ملد و مدار ہے۔ دنیا میں وہ شخص یا قوم کبھی کامیاب و کامران نہیں ہوتی جو

اپنے نصب العین کے معاملے میں مخلص نہ ہو۔ کسی ملت کے لیے سب سے زیادہ افسوسناک صورت حال یہ ہے کہ اُس کے قول و عمل کے دو جدا جدا رنگ ہوں اور اس کے اقوال سے جو امیدیں بندھتی ہوں خود اس کے عمل سے ٹوٹ جائیں۔ اجتماعی زندگی میں یہ عجیب و غریب نقطہ یاد رکھنے کا ہے کہ نقشہ زندگی پر جتنی تہذیبیں ابھریں اور جتنی قومیں کارزارِ حیات میں کامیاب ہوئیں اور پروان چڑھیں وہ سب وہی تھیں جنہوں نے اپنے تصورات کو زندہ رکھنے کے لیے ایتار سے کام لیا۔ پھر جو تہذیبیں مٹیں اور جن قوموں نے موت و ہلاکت کی آواز پر بے لک کہا وہ سب کی سب وہ تھیں جن میں اپنے دین و ایمان پر ٹٹنے کا جذبہ ختم ہو گیا اور انہوں نے مصلحت پسندی اور خود غرضی پر اپنا سیاسی تصورات کو قربان کر دیا۔ اس نصب العین کی عملی حیثیت کیا رہ جاتی ہے جس سے ہم معمولی سے معمولی لالچ کے تحت انحراف کرنے پر تیار ہو جائیں۔ وہ شخص جو کسی قوم کو یہ سبق دیتا ہے کہ تم ایک دنیاوی منفعت کی خاطر دین کے کلمے کو پس پشت ڈال دو یا دوسرے لفظوں میں فرض پر مصلحت کو مقدم رکھو وہ یا تو اس قوم کا بدخواہ ہے یا اگر خیر خواہ ہے تو اتنا سادہ ہے کہ اُس کی سادگی کے ڈانڈے سے دفعتی سے جھلکتے ہیں۔ آخر وہ فرض ہی کیا ہے جس کی بجائے آدمی مصلحتوں کی قربانی کی طالب نہ ہو۔ فرائض کی کشت تو ذاتی آرزوں اور تمناؤں کے خون سے ہی سیراب ہوتی ہے۔

یہ اصول کوئی ایسا نہیں جو صرف اسلام کے ساتھ مخصوص ہو۔ اس اصول کی کار فرمائی ہم حق و باطل دونوں میں دیکھتے ہیں۔ مغرب کی ترقی کا راز اگرچہ وہ سراسر باطل ہے، اسی اصولی میں مضمر ہے۔ اہل مغرب نے جب وطن کو اپنا ایمان ٹھہرایا تو سب کچھ اسی کی خاطر قربان کر دیا اور اب جبکہ انہوں نے سیاسی اور معاشی وحدتوں کو اپنی زندگی کی اساس قرار دیا ہے تو وہ اس راہ میں سب کچھ ٹٹا رہے ہیں۔ اپنے نصب العین کو خادم بنا کر اور اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر پھینٹ چڑھا کر دنیا میں نہ آج سے پہلے کسی کو کامیابی نصیب ہوئی ہے اور نہ کسی ہوش مند فرد نے کھنے والے انسان کو اس کی توقع رکھنی چاہیے۔ اس لیے ہم دین کے معاملے میں جس قدر جلد مکیو ہو جائیں اتنا ہی یہ ہمارے حق میں مفید اور بہتر ہے۔

اس امر کا حتمی اور قطعی فیصلہ کر لینے کے بعد کہ دین ہی ہمارا مدارِ اعلیٰ اور جوہرِ حیات ہے اور
 ہمارے مستقبل کا انحصار اسی پر متوقف ہے۔ ہمارا فرض یہ ہے کہ ہم دین کے محدود و پوری طرح
 آشنا ہوں۔ وہ قوم اپنے ملک کی حفاظت کبھی نہیں کر سکتی جسے اس بات کا علم نہ ہو کہ اس کے وطن
 کی حدود کہاں تک پھیلی ہوئی ہیں اور دشمن کی سرحد کس مقام سے شروع ہوتی ہے اسلام اور ایمانیت
 کے درمیان تفریق کے جو خطوط ہیں جب تک وہ روشن نہیں ہوتے اس وقت کہ ہم اسلام کو بطور
 نظامِ حیات کبھی نہیں اپنا سکتے۔ ان حدود کے متعین ہو جانے کے بعد ہمارا فرض ہے کہ ہم پھر پوری قوت
 طاقت سے ان کی مداخلت کریں تاکہ کوئی چور اور ڈاکو ان کے اندر گھسنے نہ پائے

مغربی استعمار کی یوں تو اسلام کے خلاف ساری سازشیں ہی انتہائی افسوسناک ہیں مگر ان میں غالباً سب سے زیادہ شرمناک سازش وہ ہے جو اس نے ہمارے دین کی سرحدوں کو توڑنے کے لیے کی ہے۔ وہ اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ اگر ہماری سرحدیں چوکیاں ضرور کڑی جائیں تو ہمیں بڑی آسانی کے ساتھ تاخت و تاراج کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ جس دن سے وہ ہمارے تنہا بی قلعہ کی بیرونی دیواروں میں تنگنا کرنے میں کامیاب ہوا ہے اسی وقت سے اسلام کے قلب و جگر پر تباہ توڑ حملے کیے جا رہے ہیں اور حالت یہاں تک پہنچی ہے کہ اب ہر پائل اور سربراہ اٹھتا ہے اور جس طرح چاہتا ہے اسلام اور ملتِ اسلام پر شکنجوں مارتا ہے۔ اس لیے ہمیں سب سے پہلے ان سرحدوں کی حفاظت اور پاسبانی کا انتظام کرنا ہوگا۔

اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے اندرونی حالات کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔ اس سلسلہ کی پہلی کوشش یہ ہے کہ ہم سب سے پہلے اپنی انفرادی زندگی کو اسلام کے سانچے میں ڈھالیں۔ —
— سادے دلی و دماغ پر استعمار نے جو اثرات مرتب کیے ہیں ان کو ہم بالکل مٹا دیں اور اس رنگ میں پوری طرح رنگ جائیں جس میں ہمیں اسلام دیکھنا چاہتا ہے۔

قلب و نگاہ کو مسلمان بنانا کوئی ایسا آسان کام نہیں جو ان کی آن میں پاتھ پتیل تک پہنچ جائے۔ اس کے لیے بڑی ریاضت اور مشقت درکار ہے۔ اس کے لیے آدمی کو اپنی تناؤں اور آندوں کا خون کرنا پڑتا ہے اور دیکھا گیا ہے کہ بسا اوقات آدمی جتن تک کی قربانی دینے پر آمادہ ہو جاتا ہے مگر اپنی کسی خواہش کو قربان کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں پاتا۔

وہ دور جس میں سے اس وقت ہم گزر رہے ہیں اس اعتبار سے بڑی سخت اور آزمائش کا دور ہے۔ غیر اسلامی افکار و تصورات نے ہماری زندگی کا پوری طرح احاطہ کر رکھا ہے۔ پھر ان باطنی نظریات کی اساس پر ایک ایسا ہمہ گیر نظام ہم پر مسلط ہے جس کی گرفت سے ہماری زندگی کا کوئی گوشہ آزاد نہیں۔ ان حالات میں خدا کے دین پر عمل کرنا معاشرت و معیشت اور سیاست کے خلاف جنگ کا اعلان کرنا ہے۔ یہ ایک ایسی جنگ ہے جس کے محاذوں کا کوئی شمار نہیں اور جس کے آلات کا کوئی شخص بھی اندازہ نہیں کر سکتا۔ اپنے نفس کے خلاف یہ مذموم آرائی خواہ کتنی ہی مشکل اور دشوار ہو مگر اسلام کے قیام کے لیے یہ ایک ناگزیر منزل ہے۔ جب تک ہم اپنی خواہشات اور آرزوئیں کو نفس کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں نہیں دے دیتے اس وقت تک استعمار مسلمانوں میں سے بڑی آسانی کے ساتھ اپنے ایجنٹ اور کارندے تلاش کرنے میں کامیاب ہوتا رہے گا۔ لیکن جس وقت اس نے یہ محسوس کیا کہ مسلمانوں کے قلب و نگاہ کو اب سوائے اسلام کے اور کوئی چیز مفتوح نہیں کر سکتی اسی وقت اس کی کمر ٹوٹ جائے گی اور اس کے توحیلے شکستہ ہو جائیں گے۔

نفس نے ساتھ اس جنگ کو کامیاب بنانے کے لیے جو خارجی محرکات کام کرتے ہیں ان میں بھی ایک بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔ ہم اس نظریہ کو تو تسلیم نہیں کرتے کہ انسان کا خارجی ماحول ہی اس کے افکار و تصورات کی صورت دہی کرتا ہے اور ہمارے نظریات و ماحول کے درمیان کا عکس ہیں لیکن اس بات کے ضرور قائل ہیں کہ سیرت و کردار کو ایک خاص سلچھے میں ڈھالنے کے لیے انسان کا ماحول کافی حد تک انسان پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر زندگی کے اجتماعی ڈھانچے بدل جائیں

تو پھر انفرادی زندگی کو اُس کے مطابق بدل دینا کافی حد تک سہل اور آسان بن جاتا ہے۔ معاشرے کی قوت ایک بہت بڑی قوت ہے اور انسان کے انفرادی رجحانات کے پیدا کرنے اور احساسات کو پسے میں اس کا بہت زیادہ دخل ہے۔ جس قوم یا ملک میں انفرادی نظریات اور اجتماعی انکار برسرِ پیکر ہوں وہ قوم یا ملک کبھی بھی ترقی نہیں کر سکتا۔ ہمارے اجتماعی تخیلات اور انفرادی احساسات میں جو کشمکش عرصہ دراز سے جاری ہے اُس سے استعمار آج تک ہر قسم کا ناجائز فائدہ اٹھاتا رہا ہے بلکہ اگر کہا جائے کہ مسلمانوں کے اندر استعمار کی آبدی اسی فکری اور عملی خلفشار نے کی ہے تو یہ چیز زیادہ صحیح ہوگی۔ لہذا ہمیں سب سے پہلے اس کشمکش کو ہر قیمت پر ختم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کی عملی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے نظام اجتماعی کے سارے شعبوں کو یعنی سیاست، معیشت اور معاشرت کو غیر اسلامی اجزاء سے یکسر پاک کر کے انہیں از سر نو اسلام کی تعمیل میں دے دیں۔ ہم جس حد تک غیر اسلامی اثرات کو زائل کرنے میں کامیاب ہونگے بالکل اسی تناسب سے استعمار پر عرصہ حیات قائم ہوتا چلا جائیگا۔

تعمیرِ فرد کے اس کام میں یہ امر اشد ضروری ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے دین اور اُس کی روایات کے پابند ہوں۔ ہماری ریاستیں اسلامی احکام کے نفاذ کا ذریعہ بنیں، ہماری معیشت اسلام کے عدل و انصاف کا مظہر ہو اور ہماری معاشرت، انسانی اخوت اور محبت کا ایک نئے نمونہ پیش کرے۔ انفرادی زندگی کی جزئیات سے لے کر اجتماعی زندگی کے بڑے سے بڑے مسائل تک سب میں اسلام ہی ہماری رہنما قوت ہو۔ ہماری زندگی کے کسی گوشے میں اور ہمارے قلب و دماغ کے کسی ریشے میں جو بیہودہ، نفوذ نہ کرنے والے ہوں۔ اس معاملے میں ہم جس قدر زیادہ احتیاط کا ثبوت دیں گے اسی قدر ہماری ملت قوت و طاقت فراہم کرے گی اور سامراجی غلام کو نہ کام بنانے میں کامیاب ہوگی۔

جس قوم کی قومیت دین اور دینی روایات سے تشکیل پائے اُس کے لیے یہ طرز عمل اختیار کرنا

بالکل فطری اور ناگزیر ہے۔ قوموں کو ہمیشہ دو قسم کے محرکات وجود بخشتے ہیں۔ ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ مثبت داعیات انسانوں کے کسی گروہ کے اندر وحدت فکر اور اشتراک عمل پیدا کر کے اُس کے مختلف اجزاء کو آپس میں جوڑتے اور اُن کے درمیان رابطہ اور ضابطہ پیدا کرتے ہیں۔ لیکن قومیت کے صحیح نشوونما کے لیے صرف یہی ایجابی محرکات کافی نہیں ہوتے بلکہ اس مقصد کے لیے ایسے جذبات بھی درکار ہیں جو ایک قوم کو اپنی علیحدگی کا شعور بخشیں۔ اُس کے اندر اس احساس کو بیدار کریں کہ اُس کا اپنا ایک مستقل وجود ہے جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

دنیا کی دوسری اقوام نے ان محرکات کو نسل، زبان، رنگ اور وطن میں فراہم کیا ہے اور اب کچھ عرصہ سے وہ انہیں سیاسی اور معاشی وحدتوں میں تلاش کر رہی ہیں۔ لیکن ان کے برعکس ملت بیضا ہمیشہ سے اپنے وجود کے لیے دین اور اس کی روایات کی رہیں منت رہی ہے۔ اس نقطہ نظر سے اگر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جو شخص ہمارے دین کے اندر رخنہ پیدا کرتا ہے وہ درحقیقت ہماری قومیت پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ اور اس طرح وہ افراد یا گروہ جو اسلام اور اسلامی تعلیمات کے ساتھ جاہلیت کا پیوند لگاتے ہیں اُن کی نعیتیں اور ارادے خواہ کتنے ہی پاکیزہ اور مقدس ہوں مگر وہ اپنی سادگی یا حماقت سے استعمار کے ٹکڑے کو اپنی قومیت کے قلعے کے اندر داخل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

بیجا نہ ہوگا اگر ہم یہاں ایک اُس اعتراض کا بھی جواب دے دیں جو ہمارے اس طنز و فکر پر ایسا اوقات کیا جاتا ہے۔ ہمارے ملک کے متحد دین جو اسلام اور کفر کے درمیان رشتہ اتحاد پیدا کرنے کے لیے بڑی شدت سے آرزو مند ہیں یہ کہتے ہیں کہ تم اسلام کے دائرہ کو خواہ مخواہ تنگ کر رہے ہو۔ اسلام کا مزاج امتزاجی ہے اور اُس میں ہر وقت اس بات کی گنجائش موجود ہے کہ وہ غیروں سے اخذ و جذب کرتا رہے۔

یہ بات ابنا ہر بڑی دل گنتی ہے اور تاریخ کے بعض واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اگر ہم ذرا گہرائی میں اتر کر اصل صورت حال کا مطالعہ کریں تو ہمیں معلوم ہو گا کہ اخذ و تذب کا وہ عمل جس کی نظیریں اپنے اسلاف کے ہاں ملتی ہے وہ آج سے بالکل مختلف ہے۔ اُس وقت امت مسلمہ ایک زندہ اور متحرک قوت تھی۔ اس کے اندر اتنی توانائی اور حرارت تھی کہ وہ ہر چیز کو بڑی آسانی کے ساتھ اپنے سانچے میں ڈھال سکتی تھی۔ لیکن آج حالات یکسر مختلف ہیں۔ اس دور میں مسلمان ہر جگہ مغلوب و مفتوح ہیں۔ تہذیب مغرب وقت کی غالب اور حکمران تہذیب ہے اور اس نے نوع انسانی کی نظروں کو خیرہ کر رکھا ہے۔ اس لیے اب اگر کوئی شخص اسلام کے اندر کفر و الحاد کے کسی جزو یا اجزا کو شامل کرتا ہے تو وہ درحقیقت اپنے تہذیبی قلعے میں اُس رستہ کو کھٹکنے کا موقع دیتا ہے جس کو اسلام اور اس کی مضبوط روایات نے ابھی تک داخل ہونے سے روک رکھا تھا۔

افراد کے درمیان بلاشبہ کسروں و انکسار کے ذریعہ مصالحت کی کئی صورتیں نکالی جاسکتی ہیں لیکن یہ عمل انکار و نظریات کے درمیان کبھی بھی کامیاب ثابت نہیں ہوا۔ جب بھی دو مختلف تہذیبوں کے اجزائے ترکیبی کو باہم جوڑ کر ایک نئی تہذیب کو جنم دینے کی کوشش کی گئی جس میں دونوں کے صالح عناصر ایک خاص تناسب سے جمع کرنا مقصود تھا، تو اہل دنیا کو سخت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ غالب تہذیب کے اجزاء نے فوراً اگے بڑھ کر اپنی قوت اور طاقت کے ذریعہ کمزور اجزاء پر اس طریق سے اپنا عمل شروع کیا کہ یہ اجزاء اپنی حقیقی قدر و قیمت بالکل کھو بیٹھے اور اپنے آپ کو بالکلیہ طاقتور عناصر میں مدغم کر دیا۔

ہمارے ہاں اسلام اور تہذیبِ غرب کے درمیان مصالحت کی جس قدر کوششیں کی جا رہی ہیں اُن کا تجزیہ کیجیے اور دیکھیے کہ یہ مصالحت اُس اخذ و تذب سے کس حد تک مختلف ہے جس کی مثال ہمیں ماضی میں ملتی ہے۔ وہاں جب بھی کسی تہذیب میں کچھ صالح اجزاء ایسے نظر آئے جو اسلامی

تمدن میں پھیلنے جانے کی صلاحیت رکھتے تھے تو انہیں پہلے تمام غیر اسلامی آلاشوں سے بالکل پاک اور منترہ کیا گیا اور پھر انہیں اس طرز پر ڈھالا گیا کہ وہ اسلامی تہذیب کا ہی ایک حصہ بن کر رہ گئے۔ اس کے برعکس آج اسلام اور تہذیب مغرب میں مصاحمت کرنے کے لیے دین حق میں اس انداز سے تحریف کی جا رہی ہے جس سے اس کی الگ حیثیت ہی ختم ہو جاتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ دین تہذیب مغرب کا ہی ایک منہ بولا بیٹا ہے۔ ان وجوہ کی بنا پر ہمیں دورِ حاضر میں مغربی افکار و نظریات کو اپنانے میں انتہائی درجہ کا حرم و احتیاط درکار ہے۔ بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ امت مسلمہ کو مغربی تہذیب کے اُن اجزاء کو بھی جو بظاہر بالکل بے ضرر بلکہ کسی حد تک نفع رساں معلوم ہوتے ہیں قبول کرنے میں خاصا تامل کرنا چاہیے۔ مغربی تہذیب، مادی فلسفہ حیات کی ہی شارح اور ترجمان ہے۔ اس میں نشست و برخاست اور راکل و شرب کے طور طریقوں سے بیکہ زندگی کے اہم سے اہم معاملات تک سب میں مادیت پوری طرح کارفرما ہے اس لیے ہمیں اپنے آپ کو اس تہذیب کے اثرات سے ممکن حد تک بچانے کی فکر کرنی چاہیے۔ ہماری ملت کا استحکام بہت حد تک ہمارے اس طرزِ عمل سے وابستہ ہے۔

یہ تو ہیں وہ تدا بیر جن پر عمل پیرا ہو کر ہم امت مسلمہ کو داخلی طور پر مستحکم بنا سکتے ہیں تاکہ وہ استعمار کے ہر چیلنج کا کامیابی کے ساتھ جواب دے سکے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے گھر کے باہر بھی کچھ اس قسم کے انتظامات کرنے چاہئیں جو بالواسطہ ملتِ بعینا کی قوت و طاقت کا ذریعہ بنیں۔

اس ضمن میں ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم استعمار کی اُن غلط فہمیوں کا پردہ چاک کریں جو اُس نے اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اپنے سامراجی عزائم کی تکمیل کی غرض سے دنیا کے گوشے گوشے میں پھیلارکھی ہیں۔

پھر ہمارے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم مغربی تہذیب اور تمدن کا اچھی طرح تجزیہ کر کے

اس کے تقاضے اور عیوب کو لوگوں پر آشکارا کریں تاکہ اس کا ظلم ٹوٹے اور لوگ کسی ذہنی مروجیت کے بغیر
اصل کا مطالعہ کریں۔

اس کے علاوہ ہمیں اس بات کی پوری کوشش کرنی چاہیے کہ ہم اس دور کی بھولی بھلی انسانیت
کو راہ ہدایت دکھائیں۔ اور اگر بالفرض ہم پوری نوع انسانی کو صحیح راستے پر ڈالتے ہیں کامیاب نہ بھی
ہوں تو کم از کم اُن سعید روحوں تک تو اسلام کا پیغام بالضرور پہنچا دیں جو حق کی تلاش میں نہ معلوم کتنی
مدت سے سرگرداں ہیں۔ اور محض بے خبری کے عالم میں اسلام اور دنیائے اسلام کی دشمن بنی ہوئی ہیں

سخت نامناسب ہوگا کہ ہم بات ختم کرنے سے پیشتر اسلام کی ایک بنیادی حقیقت کی صراحت
نہ کریں۔ اسلام بلاشبہ قوت و طاقت کا سرچشمہ ہے۔ یہ امت مسلمہ کو داخلی انتشار اور خارجی یورشوں سے پوری
طرح محفوظ رکھ سکتا ہے۔ اور نہ صرف محفوظ رکھ سکتا ہے، بلکہ اسے ہر قسم کی سرطانی اور مفرانی بھی عطا کر
سکتا ہے۔ اس کے دامن میں پناہ لینے سے لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں اور اربوں برکات حاصل ہوتی ہیں مگر
ان کے حصول کا سارا انحصار اس بات پر موقوف ہے کہ ہم اسلام کو کسی دنیاوی غرض کے لیے نہ اپنائیں بلکہ
اس کے ساتھ ہمارا تعلق خالصتہً باللہ کے لیے ہو۔ یہ فوائد جن کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے اسلام سے
دوستی کے محض ضمنی فائدے ہیں اور یہ اسی صورت میں حاصل ہو سکتے ہیں جب دین حق کے ساتھ ہم محض
اپنے حقائق اور مالک کی رضا جوئی کے لیے تعلق قائم کریں۔ یہ دین بلاشبہ ہماری اس دنیاوی زندگی کو بھی بہتر بناتا
ہے لیکن اس کی اصل غرض نوع انسانی کو آخرت میں فائز المرام کرنا ہے۔ اس مرد حق اکابر نے کس خوبی سے آخرت
اور دنیا کے تعلق کو واضح کیا جب اُس نے امت مسلمہ کو مخاطب ہو کر کہا:

”اے غافل انسانو! کیا ابھی تک تم اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکے، آخرت اور دنیا کی حقیقت پرند اور
سلنے کی سی ہے۔ اگر تم پرندے کو پکڑنے میں کامیاب ہو گئے تو سایہ خود بخود تمہارے پیچھے میں آجائیکا
لیکن اگر تم پرندے کو چھوڑ کر محض سایے کے پیچھے پڑے رہے تو نہ تمہارے ہاتھ سایہ ہی آئے گا اور نہ پرندہ۔